ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

ماخذ تحقیقی مجلہ

راؤ محمد عمر
ویزیٹنگ فیکلٹی، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر سیّدہ مصباح رضوی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر الماس خانم
اسسٹنٹ پروفیسر،، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر عالم خان کی افسانہ نگاری

Rao Muhammad Umar
Visiting Faculty, GC University, Lahore
Dr. Syeda Misbah Rizvi
Assistant Professor, GC University, Lahore
Dr. Almas khanum
Assistant Professor, GC University, Lahore

Dr. Alem Khan's Short Stories

Alem Khan is a renowned progressive thinker, educationist and fiction writer."Ghulam jimson ka noha" (Elegy of slaves) is the compilation of his short stories. Progressive consciousness, romantic and poetic diction, symbolic way of narration and subjective point of view are the main qualities which make these short stories unique. These short stories depict the themes of class discrimination, issues of lower class, identity crisis, meaninglessness, nothingness and fear.

Keywords: *Short stories, Progressive consciousness Elegy of slaves fear, Nothingness, Meaninglessness, Subjectivism, Symbolism, Anxiety, Identity crisis.*

ڈاکٹر محمد عالم خان معروف ترقی پسند دانشور اور متحرک علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ وہ پچھلی چار دہائیوں سے تعلیم و تدریس کے شعبے سے منسلک ہیں۔ نظریاتی سطح پر وہ ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہیں اور تحریک کے ایک فعال رکن کے طور پر سرگرم ہیں۔ عالم خان ترقی پسند اور طبقاتی شعور کے حامل افسانہ نگاروں میں ایک معتبر پہچان رکھتے

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ "غلام جسموں کا نوحہ" کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا۔ اس کے علاوہ "یورپ میں اردو شاعری" اور چند نئے ادبی مسائل" کے عنوان سے ان کی تحقیقی و تنقیدی کتب زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان "اردو افسانے میں رومانویت" کسی حوالے کا محتاج نہیں ہے۔ یہ سارے حوالے ان کی افسانہ نگاری کے فن سے گہری دلچسپی اور ادبی نظریات سے واقفیت کی دلالت کرتے ہیں۔ افسانوں کے عمیق مطالعے، سیاسی و نظریاتی وابستگی اور رومان پسند طبع جیسے اوصاف نے مل کر ان کے طرزِ تحریر کو جداگانہ تشخص اور منفرد اسلوبیاتی رنگ میں ڈھالا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے طبقاتی شعور کے حامل ہونے کے باوجود فقط فرد کی معاشی ضروریات اور مسائل تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ فرد کے جذبی پہلوؤں کی بھی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ گو ان افسانوں کا بنیادی موضوع طبقاتی کشمکش اور محرومیوں کا شکار سماج ہے مگر وہ اس معروضی منظر نامے میں اپنی توجہ فرد کی داخلی جہات پر ہی مرکوز رکھتے ہیں۔ فرد اس طبقاتی سماج میں جہاں ایک طرف معاشی استحصال کی چکی میں پستا ہے وہیں دوسری طرف اسے اور بھی بہت سے داخلی و جذبی مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ فرد کا المیہ فقط معاشی مسائل تک ہی موقوف نہیں، وہ روایات و اخلاقیات کے جبر تلے گھٹ گھٹ کر وجودِ غیر مصدقہ (Inauthentic Existence) کی مانند زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے اپنے اردگرد بسنے والے دوسرے افراد کے سرد مہر اور منافقانہ روّیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ تمام عمر لاحاصلیت کے جس سفر پر گامزن رہتا ہے اس لاحاصلی کا احساس بھی اسے اندر سے مسلسل کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ وہ ہر لحظہ زندگی کی لایعنیت اور بے معنویت سے بھی دوچار رہتا ہے۔ وہ پل پل اپنے ناگہانی دشمن، فنائیت کے ہاتھوں بھی مسلسل شکست آشنا رہتا ہے جو اس کی زندگی سے اس کے پیارے اور احساساتی مرکزوں کو اچکتی رہتی ہے۔ اسے ان سماجی و معاشرتی مسائل اور نظاموں کے اس جبریہ ماحول کے ساتھ ساتھ چند ازلی جذبی مسائل کا سامنا بھی رہتا ہے۔ انھی تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عالم خان کے اس افسانوی مجموعہ کو دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم خان نے فرد کے طبقاتی مسائل کے ساتھ ساتھ اس کو درپیش تمام مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان افسانوں کے کرداروں میں عدم شناخت کا المیہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ افسانے اپنی کرافٹ اور نریشن کے اعتبار سے دورِ حاضر کے جدید افسانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ یہ افسانے ستر اور اسّی کی دہائی میں مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے اور ۱۹۹۲ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ اس میں ان کے اٹھارہ افسانے بعنوان "پہلی کہانی"، "کھلے کواڑوں پر دستک"، "جا چکے سے آخری مکالمہ"، "شہر پناہ کے دروازے پر"، "بانجھ بستی میں نئی ولادت"، "غلام جسموں کا نوحہ"، "دھرتی بین کرتی ہے"، "ساکت لمحوں کی

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

موت"، "طویل ترین کہانی"، "صلیب پر لٹکا ہوا عہد"، "دوسرے کنارے سے"، "بامِ ذات سے شہر کا منظر"، "اک خواہشِ موہوم کی خاطر"، "قطار میں کھڑی کشتیاں"، "انتظار کس کا ہے"، "قیدی رہانہ ہوئے"، "جب درِ زنداں کھلا"، "روشنی کا سفر نہیں رکتا" شامل ہیں۔ اس مجموعے کے آخر میں ڈاکٹر انور سجاد کا ان افسانوں کے حوالہ سے لکھا ہوا مضمون "غلام جسموں کا نوحہ۔ جدید افسانے کے تناظر میں" کے عنوان سے شامل ہے جس میں انہوں نے عالم خان کے جدید طرزِ تحریر اور ان افسانوں کے خصائص پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ وہ عالم خان کی افسانہ نگاری پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ افسانے ماڈرن فکشن کی روایت کی توسیع ہیں۔ ان افسانوں میں "وجودِ آزاد" کا المیہ ہے جو صنعتی پھیلاؤ کی وجہ سے ہوا ہے۔۔۔ یہ کہانیاں تیسری دنیا کے ملکوں کے نچلے اور کچلے ہوئے طبقات کی کہانیاں ہیں۔ افتادگانِ خاک کی کہانیاں ہیں، خوشیوں سے محروم انسانوں کی کہانیاں ہیں۔ ایسے افسانوں میں زندگی بسر کرنا اور پھر انہیں اپنی تخلیقات کا موضوع بنانا تیسری دنیا کے افسانہ نگاروں کا وصف رہا ہے۔"(۱)

جبکہ عالم خان کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے ثمرین اپنے ایم فل کے مقالے بعنوان "ڈاکٹر محمد عالم خان کی ادبی خدمات" میں یوں رقمطراز ہیں:

> "عالم خان کی نظر میں یہ سماج کا بہت بڑا المیہ ہے کہ تمام مناظر دھندلا رہے ہیں اور اشیا بے معنویت کی دھول میں لپٹی ہوئی ہیں۔ یہ سارا عمل افسانہ نگار کی مخصوص نظریاتی سوچ اور طرزِ احساس کو جنم دیتا ہے۔ عالم خان کے ہاں کربناک مسخ چہرے والی بے خواب ویرانی ایک اہم موضوع ہے۔ اس ویرانی میں کہانی خود ان کی اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے اور ارد گرد پناہیں تلاش کرتی ہوئی کائناتی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔ ان کے ہاں "وہ" اور "میں" دو ایسے کردار ہیں جو اس ویرانی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کبھی "وہ" "میں" کو تلاش کرتا ہے اور کبھی "میں" "وہ" کو۔ اور کبھی دونوں اپنے آپ کو تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ ہر تین صورتوں میں لاحاصلی ان کا مقدر بنتی ہے۔ اور کچھ پانے کی بجائے وہ خود کو کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ ماحول کے جبر میں فرد کی حیثیت معدوم ہو جانے کا مسئلہ ہے۔ شخصیت جب ٹکڑوں

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

ماخذ تحقیقی مجلہ

میں بٹ جائے تو پہچان جاتی رہتی ہے۔ پہچان باقی نہ رہے تو نہ ہونے کی اذیت کلبلانے لگتی ہے۔"(۲)

"غلام جسموں کا نوحہ" میں شامل یہ افسانے اسلوب، بیانیے اور بُنت کے اعتبار سے جدید اور منفرد انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔ بیشتر افسانوں میں شعور کی رو (Stream of consciousness) اور آزاد تلازمہ خیال (free association) کی تکنیک کو برتا گیا ہے۔ یہ افسانے جدید علامتی افسانے کے قبیل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان افسانوں میں علامات کی قابلِ قبول اور قابلِ فہم سطح دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہاں قابلِ فہم سطح سے مراد ہے کہ یہ عام قاری کی فکری و تفہیمی سطح سے عدم مطابقت نہیں رکھتی اور نہ ہی یہ علامتی پن قاری کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ یہ میانہ روی کی حامل وہ سطح ہے جو ایک سیدھے سادھے پلاٹ پر مشتمل روایتی افسانوں سے ذرا مختلف تو ہے مگر تجریدیت کے علاقے میں قدم نہیں رکھتی۔ ان افسانوں میں استعمال ہونے والی علامتیں زمینی حقائق اور سماج سے جڑی ہوئی ہیں۔ علامتی افسانے میں علامتی نظام یوں تو شعری تشبیہاتی و استعاراتی نظام کی طرح ہی وضع کیا جاتا ہے مگر اس میں ادیب اسے مکمل طور پر قاری کے نقطۂ نظر پر نہیں چھوڑتا بلکہ افسانے کے بڑھتے ہوئے پلاٹ اور کہانی کے ساتھ ساتھ اس علامت کے مفاہیم کی بھی گرہ کھولتا چلا جاتا ہے۔ جب افسانہ ختم ہوتا ہے تو رمز و کنایہ کے اس نظام کی بدولت قاری کو لگتا ہے کہ اس نے اچھی طرح سے اس علامت کو پالیا ہے۔ یہ نظام دراصل اخفا کی طرز پر کام نہیں کرتا بلکہ اس میں ایک ارتقائی عمل کارفرما ہوتا ہے جو بتدریج قاری پر اپنی گرہیں کھولتا جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو ایسی علامتیں افسانے میں ابلاغ کے مسائل کو جنم دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں علامتی افسانے پر ہونے والی تنقید میں ان افسانوں میں موجود "ابلاغ"(۳) کے مسائل کی نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ ہمارے ہاں افسانے کی روایت اور ارتقا سے متعلق پائے جانے والے تصورات میں ایک تصور یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے جو کسی حد تک مبنی بہ حقیقت بھی ہے کہ ہمارے یہاں علامتی افسانہ ۱۹۶۰ اور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے ایک مخصوص جبریہ ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس مخصوص جبری ماحول میں علامتی پن کا بطور تحریک سامنے آنا الگ بات ہے مگر اردو افسانوں میں علامت نگاری کی روایت اور اس کی ضرورت و افادیت کو اس ایک خاص جبریہ ماحول سے مختص کرنا ایک غیر تنقیدی اور غیر فکری رویہ ہے۔ دیگر ادبی رجحانات کی طرح اس رجحان کے سوتے بھی ہماری ادبی روایت کے ارتقا سے جڑے ہوئے ہیں اور بقول ڈاکٹر انور سدید، "اردو افسانے میں علامت کا استعمال اچانک شروع نہیں ہوا بلکہ افسانے کا شانہ روایتی افسانے کے ساتھ ملا ہوا ہے۔"(۴) اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر عالم خان کے افسانوں میں

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

موجود علامتوں کو دیکھا جائے تو یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کی علامتیں ہمارے سماج سے جڑی ہوئی اور زمینی حقائق میں پیوست ہیں۔ اس امر کی دلالت کے لیے چند علامتی اقتباس درج ذیل ہیں:

"لمبا بانس کھینچے رسے پر چلنا..... ایک سرے سے دوسرے کونے تک..... صحیح سلامت رہنا..... دو لقموں کا مول ہے۔"(۵)

"نمبر ایک نے مغرب کی طرف منہ کر کے، ایک زوردار سلیوٹ مارا.....؟"(۶)

"رفتہ رفتہ ساری خواہشوں نے یوں ہتھیار پھینک ڈالے کہ جیسے ہندسوں میں، ان کی تعداد بھی نوے ہزار ہو گئی ہو۔"(۷)

اس علامتی پیرایے کے علاوہ ان افسانوں کی دوسری بڑی خوبی ان کا رومان پسند ڈکشن، طرز تحریر اور تاثر ہے۔ جو قاری کو رک رک کر داد دینے پر مجبور کرتا ہے۔ ان کا طرزِ تحریر قاری کو تخیل و رومان کے سحر میں جکڑے رکھتا ہے۔ وہ لفظوں سے رومان کا ایک بُت تراشتے ہیں اور اس بت کی تجسیم سے زندگی کے کسی جذبی پہلو کی بھرپور عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان افسانوں کا علامتی نظام ان کے رومانوی ذوق پر انحصار کرتا ہے۔ بعض افسانے اسی علامت کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں اور بعض میں ان کا رومانوی اسلوب بین السطور تجسیم اور تشبیہاتی اور استعاراتی انداز میں علامتوں کو گھڑتا چلا جاتا ہے۔ بعض افسانوں میں کرداروں کے نام، افسانے کا زمانی پسِ منظر، مکانی محلِ وقوع علامتی انداز میں ایک سے زیادہ تاریخی اور معنوی پہلوؤں کا احاطہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ رات کا منظر، سحر کا انتظار، صحراؤں کی بازگشت، کالی کوٹھڑی، نمبر ایک اور نمبر دو کا مکالمہ، جیل کا نمبر دار، شب کے سناٹے سے ابھرتی بھاری بوٹوں کی آوازیں، روشن چہرے والے بزرگ کا رجائی وعظ اور کہانی بذاتِ خود افسانوں میں اپنی معنوی پرتیں کھولتی چلی جاتی ہے۔ افسانوں کا مجموعی رومانی اسلوب، رومان کے برش سے زندگی کی حقیقی جہات کی تصویر کشی کرتا ہے سو ان افسانوں میں حقیقت و رومان کا وہ حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے جو ان افسانوں کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ ان کی افادیت میں بھی اضافہ کر دیتا ہے۔ اس ضمن میں چند اقتباسات بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

'جانے کشتیاں کنارے لگ جاتی ہیں یا کنارہ کشتیوں کو لگ جاتا ہے..... اور وہ ٹوٹ جاتی ہیں۔"(۸)

" سارے گھر کے لیمپوں نے روشنی کو تھوک دیا ہے۔۔۔۔۔ ہر کوئی خود کو آگ لگا کر تڑپ رہا ہے۔۔۔۔۔ سب نے اپنے اپنے حصے کا زہر نگل لیا ہے۔۔۔ بسیں، ٹرینیں، لوگ، مسافر

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

ایک دوسرے سے ٹکراتے پھرتے ہیں، کسی کو راہ نہیں ملتی۔۔۔۔۔ پیچھے رہ جانے اور آگے کچھ نہ ہونے کی دیوار نے رستہ روکا ہے۔۔۔۔۔ ساری دنیا میں کہرام بپا ہے"(۹)

"بس یونہی دل چاہتا ہے کہ تمہیں اور صبح کو ایک ہی وقت میں ہنستا اور مسکراتا دیکھوں!"(۱۰)

عالم خان کے ہاں رومانیت فقط زندگی کی اک فلسفیانہ اور نظریاتی جہت تک محصور نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں یہ وہ نقطۂ نظر یا وہ چشمہ ہے جس سے وہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ پہلو حزن آفریں ہو یا کیف و مسرت آفریں، دونوں صورتوں میں ان کا نقطۂ نظر اور بیانیہ رومانیت کے قالب میں ڈھلا نظر آتا ہے۔ بقول غالب

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں (۱۱)

"دھرتی بین کرتی ہے" افسانے سے درج ذیل اقتباسات اس رومانی جہت کی کیا خوب صورت عکاسی کرتے ہیں:

"ازل سے لے کر ابد تک رہنے والی زیست کو چند سانسوں کا پہناوا ملا ہے..... پوری زندگی کو ناپ کر لباس نہیں بنایا گیا..... اس لیے ہم مجبور پرندے اڑتے اڑتے پھڑک کر گر جاتے ہیں..... جیسے لمبی بات سے کوئی جملہ گر جائے۔۔۔"(۱۲)

"اخبار اور سینما ہال تنہائی کے پھیلتے زہر کو جتنی دیر تلک روک سکیں تو بہتر ہے..... لیکن پیچھے مڑ کر پتھرا جانے سے آگے چل کر مر جانا اچھا لگتا ہے..... اور پھر..... ماضی کی تلاشی لینے سے حال غنی نہیں ہو سکتا....."(۱۳)

عالم خان کا اسلوب اور جملہ سازی کا قرینہ اپنی بُنت میں کمال مہارت کا مظہر ہے۔ ان کے جملوں کی ساخت مضبوط اور لب و لہجہ کاٹ دار ہے جو قاری کی احساساتی اور جذبی سطح پر اپنا بھرپور تاثر چھوڑتا ہے۔ ان کے جملوں کے مابین علامتِ حذف، اختصار یے "..." (ellipsis) لگا کر بعض دفعہ دنوں، مہینوں کا وقفہ لیا گیا ہے اور بعض دفعہ دو جملوں کے مابین یہ دورانیہ زمانوں کا فاصلہ طے کر جاتا ہے۔ عالم خان اپنے افسانوں میں بڑے بڑے خیالات کو انتہائی سہل انداز میں بیان کرتے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اجملے کے کوزے میں خیالات کا دریا بند کرنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ وہ نا صرف دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن جانتے ہیں بلکہ کوزے سے دریا نکالنے کا بھی ہنر رکھتے ہیں۔

ان افسانوں میں خواہشات کا ذکر جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ خواہش وہ غرض و غایت اور اتصالی نقطہ ہے جس سے فرد کسی المیے کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ عالم خان کے یہاں خواہشات کی دو رخی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایک طرف یہ خواہشات فرد کی امید ورجا کو بنیاد فراہم کرتی ہیں اور فرد کو جستجو اور عمل پر پیہم متحرک اور فعال ہونے پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ خواہشات فرد کے مادی و جذبی ہر دو پہلوؤں کی آسودگی اور تسکین کے سامان کا احاطہ کرتی ہیں۔ دوسری طرف یہ خواہشات فرد کی جذبی محرومیوں، لاحاصلی اور ادھورے پن کی علامت اور محدودیت کا پیمانہ ہیں۔ یہ ہونے کی پرخلش آگہی اور ہوسکنے کی امید انسان کو بے کل اور بے چین کیے رکھتی ہے۔ وہ خود کی تکمیل اور آسودگی کے لیے مسلسل سرگرم عمل رہتا ہے اور سسی فس (Sisyphus)[۱۴] کی مانند خواہشات کا بارِ عظیم اپنے کندھوں پر لاد کر کوہِ زیست کی چڑھائیاں چڑھتا رہتا ہے۔ ایک کے بعد ایک نئی خواہش کا جنم اسے تمام عمر اسی مشقت میں ڈالے رکھتا ہے۔ عالم خان کے یہاں خواہش کی جو سطح دیکھنے کو ملتی ہے وہ فرد کی احساساتی و داخلی بقا کے لیے لازم ہے ان کے ہاں خواہش کا معیار بقائے زیست اور ضروریاتِ زندگی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہاں یہ خواہش اس شوق اور تعیش پسند طرزِ زندگی سے یکسر مختلف ہے جو ایک مخصوص طبقے کی طرزِ زیست اور سرمایہ دارانہ نظام کے بقا کو جواز فراہم کرتی ہے۔ خواہش کے حوالے سے "اک خواہش موہوم کی خاطر" افسانے سے ان کا یہ اقتباس قابلِ ذکر ہے:

> "مگر خواہش..... ایک ایسا خونی سمندر ہے جس کا بے رحم دہانہ کبھی نہیں بھرتا..... وہ کیسی خواہش ہے جو اپنے ساتھ نئی خواہش کو لاتی ہے اور خواہشوں کے اس بھنور میں ہم ہمیشہ ڈوب جاتے ہیں..... ہم لوگ مر جاتے ہیں... خواہش نہیں مرتی۔۔۔"[۱۵]

خواہشات کی بات ہو یا فرد کی حقیقی زندگی کے پہلوؤں کی عکاسی، عالم خاں کے افسانے داخلیت نگاری کی بہترین مثال ہیں۔ ان افسانوں کا بنیادی موضوع فرد کی داخلی و احساساتی سطح ہے۔ یہ تمام افسانے ہمارے محبوس مقامی عہد میں فرد کی المیاتی و سانحاتی جہات کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں حالات و معروض کا جبر بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور وجودی محدودیت کا بیان بھی، ازلی لایعنیت (Meaninglessness) کا بیان بھی ان افسانوں کا خاصہ ہے اور لاحاصلیت، نیستی (Nothingness) اور بے چہرگی و عدم شناختی کے حامل فرد کی تصویر کشی بھی ان افسانوں کا حسن ہے۔ خواہش اک بے لگام گھوڑا ہے جبکہ فرد جسمانی و حیاتیاتی سطح پر محدودیت کا شکار وہ وجود ہے جو تمام تر کوششوں اور محنت کے باوجود بہت سی خواہشات کو حاصل کرنے میں ناکام رہ جاتا ہے۔ لاحاصلیت وجود کا ازلی المیہ ہے۔ وہ اپنی ہستی میں لاحاصلیت کی زندہ جاوید مثال بھی ہے اور اس لاحاصلیت کی مادی تجسیم بھی۔ عالم خان

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

کے ہاں جگہ جگہ اس لاحاصلیت کی مختلف شیڈز کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے جن کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

"لکڑی کا گیلا پُل ہو..... اس کا ہاتھ ہو یا کسی کا نازک کندھا..... سب کا حاصل..... لا حاصل ہے..... ڈوبتے دن کا آخری پہر ہے..... ذات کا دہانہ خالی ہے۔ میری کہانی کون سُنے گا۔"(۱۶)

"بے آباد زمینوں میں خوابوں کا کوئی مسکن نہیں ہوتا..... موت کے اس علاقے میں سبزہ نہیں اُگتا..... تنہائی کے ویرانے میں دہلیزیں نہیں ہوتی..... یہ سچ ہی سہی..... لیکن..... اس شہر نادیدہ کا کیا ہوا جو اس منظر سے پہلے تھا..... اس کھنڈر کی تہوں میں بہت نیچے..... ہمارے شہر بسے ہیں..... ہمارے خواب زندہ ہیں..... ہمارے قافلے والے..... سنگی اور ساتھی ان ٹیلوں کے نیچے سانس لیتے ہیں..... اور یہ صحرا عکس ہے ان کی نامرادی کا..... جو وہ چاہتے تھے..... نہ کر پائے..... جو سوچا تھا ویسا نہ ہو پایا....." (۱۷)

انسان عمل و جستجو کا پیکر ہے۔ وہ تمام عمر اپنی شعوری حالت میں آنے کے بعد اپنی خواہشات اور امکانات کے حوالے سے سے چناؤ کے عمل سے گزرتا رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود بعض خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا حاصل فقط لاحاصل ہوتا ہے۔ وہ سدا جی سکنے کی خواہش ہو، حقیقتِ کل تک رسائی کی ہو، سوئے عدم سدھار چلوں کی واپسی کی ہو یا مثالی سطح پر کچھ بڑا کر سکنے کی ہو، ان سب کا نتیجہ لاحاصلی ہے۔ انسان کی مثال بحرِ زمان میں اس قطرے کی سی ہے جو خود تو دو کناروں تک سفر نہیں کر سکتا فقط اگلے قطرے کو تحرک دے سکتا ہے۔ ہم وقت کے پردے پر کھیل کے درمیان میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور کھیل ختم ہونے سے پہلے ہی ہمارا فنا پذیر ہونا یقینی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں لاحاصلیت اور لایعنیت ایک نقطے میں سمٹ کر وجود کو وجودی المیوں سے روشناس کراتے ہیں۔ "دوسرے کنارے سے" یہ اقتباس انہی خیالات کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے:

"مجھے اپنے پروں سے وقت کی گرد کو جھاڑتے جھاڑتے بیس برس لگے، میں خواہش کی اس تتلی کو نہ پکڑ پایا..... بھاگتے بھاگتے بدن پسینے سے شرابور ہو گیا..... سانس پھولنے لگا۔ پاؤں شل ہو گئے..... لیکن جب میں پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ میں نے صرف چند فٹ کا فاصلہ طے کیا ہے۔ یعنی میز کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آ پہنچا ہوں۔ لیکن جو بھی سامنے آ کر بیٹھتا ہے یوں لگتا ہے..... کہ وہ مجھ سے میلوں دور کھڑا ہے..... یہ وقت کی ستم ظریفی ہے، یا عہد کی مجبوری کہ آمنے سامنے رہنے والے دونوں ہی اپنے ہونے کے ان دیکھے جہنم میں جلتے رہتے ہیں لیکن ہنستے رہتے ہیں۔"(۱۸)

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

"عزیز و تمام دکھ ہے" کے مصداق فرد کی تمام زندگی بیک وقت مسرت و الم کے جذبی پہلوؤں کے مابین جھولتی رہتی ہے۔ اس کی تنہائی اور نیستی اس کے ساتھ جنم لیتی ہے۔ وہ تمام عمر جن سرابوں کے تعاقب میں بھاگتا چلا جاتا ہے۔ ذرا ستانے کو رُکے تو اسے اس سفر کی لاحاصلیت اور لایعنیت کا احساس ستانے لگتا ہے۔ وہ نقطے جو اس کی ذات کی خواہشات کا محور ہوتے ہیں اچانک کسی اضافی پر تھکن سفر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ ان خیالات سے ان احساسات سے جس قدر فرار ہونے کی کوشش کرے، بے سود ہے۔ کیونکہ اس کی داخلی دنیا اس کی ہم قدم ہے۔ وہ جس بھی حالت میں ہو جہاں بھی ہو اپنی داخلی و احساساتی سطح سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام عمر وہ اپنے اجذبی پہلوؤں اور احساساتی بوجھ تلے دبا رہتا ہے۔ عالم خان اپنے کرداروں کی فراریت کے سفر میں بہت دور تک ان کرداروں کی کیفیات کا تعاقب کرتے ہیں اور انہیں قابلِ اظہار بنانے کی ہر ممکنہ کوشش کرتے ہیں۔ ان داخلی پہلوؤں اور احساساتی کیفیات کا اظہار کرتے یہ چند اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "یہ ہونا کس قدر خلش انگیز ہے..... کچھ دھیان میں نہیں آتا کہ کیسے کیونکر سارے دھاگے آپ ہی آپ ذات کے گرد اگرد سنہرا سا جال کھڑا کر دیتے ہیں، اور پھر اپنا ہی دھڑ جلتی، تپتی تارکول کی سڑک کے کنارے کچلا ہوا پڑا رہتا ہے اور کسی کو ذرہ بھر بھی پتہ نہیں چلتا کہ ایک چولہا ٹھنڈا ہو گیا ہے..... موجود سے لے کر..... ناموجود تک کی حقیقت کتنی دلچسپ اور بے رحم ہے اور اس تماشائے ہستی سے آگہی ایک ایسی کڑی سزا ہے جس کی زنجیروں میں جکڑے ہمیشہ جھوٹ موٹ سے زندہ رہنا پڑتا ہے..... شاید یہی وجہ ہے کہ میں بڑے کرب اور سکوت سے زندہ ہوں، لیکن آتی جاتی رتوں کو مسلسل لاتعلقی سے دیکھنے کا عمل زندہ رہنے کا کوئی معتبر جواز نہیں۔ ایک "حیاتِ محض" ہے جو کئی نسلوں، کئی جگوں کو چاٹ رہی ہے۔" (۱۹)

> "برفیلے شہر کی جگہوں میں دو سائے گھومتے ہیں ایک سایہ اس کی اپنی ذات کا..... اور دوسرا اس اَن ہونی کا، جس کے ہونے میں پورے دس سال لگے تھے!" (۲۰)

> "ہم فرار چاہتے ہیں مگر فرار کے سارے راستے بند ہو چکے ہیں..... جس طرف بڑھیں ان پتھریلی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر ریزہ ہونا پڑتا ہے"۔ (۲۱)

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

ان افسانوں کی مجموعی فضا جبر سے تعبیر ہے یہ جبر ذاتی و داخلی نوعیت کا بھی ہے اور معروضی و خارجی سطح کا بھی۔ یہاں یہ جبر فقط مارشل لاء کے دور، سیاسی پابندیوں اور استحصالی اقدار تک ہی محدود نہیں بلکہ ان افسانوں میں فرد کے امکانات کو سلب کرنے والی معاشرتی روایات اور اخلاقی اقدار کا جبر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ دورُخا جبر قاری کے لیے غیر مانوس نہیں ہے۔ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں اس جبر کو محسوس کرتا ہے۔ خوف کے یہ سائے مسلسل اس کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ تشویش(Anxiety) اس کے شعور کی ہمزاد ہے۔ وہ تمام عمر اَن دیکھے، اَن چاہے، مسلط کردہ اور ناگہانی جبر یہ حالات سے جُوجتار ہتا ہے سو یہ افسانے جن جذبی و داخلی پہلوئوں سے علاقہ رکھتے ہیں وہ ان افسانوں کو عالمگیری اور آفاقی ادب کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ جبر اور خوف کی مختلف سطحوں کی عکاسی کرتے یہ اقتباس دیکھیے:

> ”ایسی نیند جو پہرے داروں کی سیٹی، بھاری بوٹوں کی آہٹ اور شب خون کے خوف سے سہمی رہے..... گھبراہٹ اور بے چینی سے آنکھ نہ لگنے پائے..... کیسے کوئی خواب دکھا سکتی ہے..... کیا سکھ دے سکتی ہے..... اس سے بہتر ہے کھلی آنکھوں سے ایک ایک لمحے، ایک ایک منظر کو دیکھا جائے..... صبح، شام اور رات کے سارے عرصے ایک ہی خوف اور جبر میں لپٹے ہوئے ہیں.....“(۲۲)

”برف اور دھند میں راہ بنانا سخت منع ہے۔ آزادی کی افواہ پھیلانا جرم ہے۔ یہ خوف کا دوجا سایہ ہے۔ جس کی عمر دونوں جہانوں جتنی ہے اور ہم ایک بالشت لمبی عمر کی خاطر اس خوف سے لڑتے رہتے ہیں۔“(۲۳)

"ہم وہ پرندے ہیں جن کی ولادت پنجروں میں ہی ہوتی ہے..... ہماری اولین آماجگاہ ہی..... ہماری آخری منزل ہے..... مسلسل قید میں رہنا..... بے آشیاں رہنا....."(۲۴)

عالم خان کے افسانوں میں گہرا مارکسی اور طبقاتی شعور دیکھنے کو ملتا ہے اس کی بڑی وجہ اُن کی مارکسی اور سوشلسٹ نظریات سے سیاسی و ابستگی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا فعال رکن ہونا ہے مگر ان افسانوں کو فقط اسی روایتی سیاسی و نظریاتی چھاپ کے زیرِ اثر دیکھنا ان افسانوں کا حق مارنے کے مترادف ہے۔ ان افسانوں میں دلّت اور پرولتاری طبقے کے مالی استحصال کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کی جذبی و داخلی کیفیات اور مسائل کا اظہار ان افسانوں کو داخلیت نگاری کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ افسانے عالم خان کی زمینی حقائق سے واقفیت اور انسانی رویّوں کے بغور مشاہدے کی دلالت کرتے ہیں۔ عالم خان کے افسانوں کی یہ فضا، پس منظر اور کردار تخیلاتی سے زیادہ تجرباتی سطح پر

انحصار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ افسانوں میں بین السطور مصنف کی میں اور شعور کی موجودگی ہر جگہ قاری کو اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ انہی خیالات اور آراء کی تائید کرتے اقتباسات درج ذیل ہیں:

"چوکیدار خان بابا آگ تاپتے ہوئے صبح کا انتظار کرتا ہے مگر وہ دن نکلنے سے پہلے سو جاتا ہے وہ آج پھر وقت پوچھے گا مگر وقت اسے کبھی نہیں پوچھے گا۔" (۲۵)

"بے ربط باتیں کرنے والا دیواری پینٹر، فلسفی بڈھا، رات بھر جاگنے والی نرس، جھوٹے عہد وپیماں کرنے والی ڈرامہ آرٹسٹ، کینوس پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنے والا نوجوان، پیٹھ پر بوجھ لادنے والا مزدور، جھک کر ٹپ وصول کرنے والا بیرا، ننھے سے ہاتھوں سے پالش کرتا ہوا معصوم لڑکا اور غیر فنی اغراض کے لیے استعمال ہونے والا فنکار اپنی بھوک کے الاؤ میں ریزہ ریزہ بکتے ہیں۔۔"(۲۶)

"بڑے زمانے میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس منڈی میں کس طبقے کا غم سب سے مہنگا ہے۔"(۲۷)

پاکستان جیسے ترقی پذیر اور طبقاتی نظام کے حامل معاشروں میں عورتیں روایات اور معاشی استحصال کی دوہری چکّی میں پستی ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک میں جہاں معاشی ناآسودگی ان کے امکانات و ممکنات کو محدود کرتی ہے وہیں تنگ نظر اور فرسودہ روایات و اقدار انھیں مخصوص قالب میں ڈھال کر انھیں بے جان مادی اشیا کی مانند گوشت پوست کی کوئی چیز یعنی وجود بذاتِ خود (Being in Itself) (۲۸) کی مانند زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور سماجی چھاپ سازی (Social labeling) کے عمل سے وہ اپنے وقار اور شخصیت دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ صارفی اور سرمایہ دارانہ نظام ان کے گھروں سے نکل کر کام کرنے کا متقاضی ہے اور معاشرتی جنسی پیمانے اسے سامانِ تلذذ سمجھنے پر بضد ہیں۔ جب کے سماجی و اخلاقی پیمانے اس سے بالکل الگ قسم کے معیارات کا تقاضا کرتے ہیں۔ انہی دوہرے پیمانوں اور معیارات نے اس کی نفسیاتی سطح کو بری طرح مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔۔" غلام جسموں کا نوحہ" میں گہرا نسوانی و تانیثی شعور (Feminist consciousness) عورتوں کے انہی مسائل کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے اور ان استحصالی پیمانوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے۔ نسوانی شعور کی عکاسی کرتے یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

"ریسیپشن روم کے کسی کونے میں ہر رات کی طرح آج بھی ہر آنے والے کو..... ویل کم اور جانے والے کو بائی بائی (Bye Bye) کہنے والی سانولی سلونی نرس اپنے ہونٹوں پر کرب آلود مسکراہٹ سجائے بیٹھی تھی۔" (۲۹)

"میں ٹائپ بھی کر سکتی ہوں، آپ کے سارے فون سنوں گی، فائلوں کو لاکر میں سنبھال کے رکھوں گی..... اور..... پھر کوئی بھی کام جو آپ کہیں گے کر سکتی ہوں۔ ضرورت مند ہوں اور مجبور بھی۔" (۳۰)

"گھر تو اپنی خواہش سے آباد ہوا کرتے ہیں..... اور میں اس گھر میں بے خواہش کا جیون کاٹ رہی ہوں....." (۳۱)

"۔۔۔ جہیز ملبے میں کئی سانولی مسکراہٹیں دب گئی ہیں..... کسی کو خبر نہیں۔" (۳۲)

عالم خان کی فنّی و تکنیکی صلاحیتوں اور " غلام جسموں کا نوحہ " کے موضوعاتی و اسلوبیاتی جائزے سے متعلق درج بالا مباحث کو جامع تلخیص میں سمیٹا جائے تو یہ کہنا بجا ہو گا کہ عالم خان کا بیانیہ اور تکنیک اپنی نوعیت میں جدید تر قالب میں ڈھلی نظر آتی ہے۔ فقروں کی بُنت مضبوط اور اسلوب شعریت اور رومان کی فضا میں ڈوبا ہوا ہے۔ کرداروں کا لب ولہجہ مکالماتی اور ڈرامائی انداز میں آگے بڑھتا ہے۔ کرداروں کی تخلیق کے ارتقائی سفر میں لاروائی سطح سے لے کر حصول شناخت تک، ہر قسم کے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ " غلام جسموں کا نوحہ " میں شامل ان افسانوں کے موضاعات کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ افسانے ترقی پسندیت اور داخلیت نگاری سے تعبیر ہیں جہاں ان افسانوں کا پس منظر، زمان و مکان، معروضی عہد اور جہت، ترقی پسند خیالات کی ترویج کرتی ہے جبکہ اس کے کردار اور کہانی داخلیت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ اسی دوہری جہات پر مبنی ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر دور کے قاری کے لیے اس کا ذاتی اور عہدی نوحہ ثابت ہوں گے اور یہی زمانی و مکانی سفر طے کر کے بقا پانے والا ادب عالمگیر اور آفاقی ادب کہلاتا ہے۔

حوالہ جات

(۱)-انور سجاد، "غلام جسموں کا نوحہ جدید افسانے کے تناظر میں "مشمولہ **غلام جسموں کا نوحہ** (لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۲)، ص ۱۲۹-۱۳۰-

(۲)- ثمرین، **ڈاکٹر عالم خان می ادبی خدمات** (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل، منہاج یونیورسٹی، ۲۰۱۷، مخزونہ: منہاج یونیورسٹی لاہور)، ص۹۱-

(۳)-ڈاکٹر جمیل جالبی، "سوال یہ ہے: علامتی افسانہ، ایک منفی اجحان"، مشمولہ **علامت کے مباحث**(لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۵ء)، ص۵۴۹-

(۴)انور سدید، ایضاً، ص۵۵۷

(۵)- محمد عالم خان، **غلام جسموں کا نوحہ**(لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۲)، ص۹۲

(۶)-ایضاً، ص۶۲-

(۷)-ایضاً، ص۲۳-

(۸)-ایضاً، ص۹۷-

(۹)-ایضاً، ص۵۷-

(۱۰)-ایضاً، ص۱۲۳-

(۱۱)-میرزا اسد اللہ خاں غالب، دیوانِ غالب(نسخہ عرشی)، مرتب امتیاز علی خاں عرشی(لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۱ء)، ص۴۳۸-

(۱۲) محمد عالم خان، **غلام جسموں کا نوحہ**(لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۲)، ص۵۶-

(۱۳) ایضاً، ص۵۶-

(۱۴)- Cotterell, Arthur, and Rachel Storm. 2005. *The Ultimate Encyclopedia of Mythology*. London: Hermes house.p83.

(۱۵) محمد عالم خان، **غلام جسموں کا نوحہ**(لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۲)، ص۹۱-

(۱۶)ایضاً، ص۱۰۵-

(۱۷)ایضاً، ص۷۴-۷۵-

(۱۸)ایضاً، ص۷۹-۸۰-

(۱۹)ایضاً، ص۱۰۹-

(۲۰)ایضاً، ص۱۱۵-

(۲۱)ایضاً، ص۸۶-

(۲۲)ایضاً، ص۱۲۳-

(۲۳)ایضاً، ص۱۱۵-

(۲۴)ایضاً، ص۹۱-

(۲۵)ایضاً، ص۸۷-

(۲۶)ایضاً، ص۸۸-

(۲۷)ایضاً، ص۵۶-

(۲۸)- Gill, Richard, and Ernest Sherman. 1973. *The Fabric Of Existentialism*.
New Jersey : Pentice Hall Inc.p20.

(۲۹)ایضاً، ص۸۷-

(۳۰)ایضاً، ص۸۰-

(۳۱)ایضاً، ص۹۲-

(۳۲)ایضاً، ص۱۹-